

حضرت مولانا عتیق الرحمن سہیلی (لندن)
مدیر اعزازی القرآن بلکھنو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

(مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایک مطالعہ)

عمر کے چوبیس سال پورے ہوئے تھے کہ مولانا اپنی کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ کے ذریعے دین و ملت کی خدمت کے افق پر نمودار ہوئے اور یہی کتاب انکی آئندہ زندگی کا سنگ بنیاد بن گئی۔ اپنی سوانح حیات (کاروان زندگی) میں اس تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”اب وہ زمانہ اور مبارک موقع آیا جو میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ ایک نئے اور مبارک دور کا آغاز“ (ج اول ص ۱۶۷) ایک صفحے کے بعد اسی مبارک آغاز کے بارے میں پھر لکھتے ہیں ”یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفرین ثابت ہو گا۔ (۷۰-۱۶۹) کتاب کا ایک اقتباس بھی اس موقع پر درج فرمایا گیا ہے جس میں مولانا کی زندگی کے نئے اور عہد آفرین دور اور اسکی خصوصیات کا عکس جھلک رہا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

”کیفیات ایمانی کے جان نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للہیت کی ایسی بادیہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل جوش جہاد ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے۔ آدم گری و مردم سازی، اصلاح و انقلاب کے ایسے محرک العقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کیا ضرور ہیں“ (ص ۱۶۹)

مولانا نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں دین کے ساتھ وسیع معنی میں علم و ادب کا بھی دور دورہ تھا خود آپ کے والد ماجد جو مختلف جہات کی علمی و ادبی شانیں رکھتے تھے۔ ایک طرف ”نزہۃ الخواطر و بہجۃ المامع و النواظر“ جیسی بیش بہا علمی و تاریخی عربی تصنیف کا فخر حاصل فرمایا تو دوسری طرف ”گل رعنا“ جیسی اردو شعر و ادب میں پائے کی کتاب بھی آپ کے قلم

سے نکلی۔ حضرت دادا صاحب بھی صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ اس خاندانی ماحول سے آگے بڑھ کر ندوۃ العلماء کا علمی و ادبی ماحول آتا ہے۔ پھر ذاتی ذوق بھی ماشاء اللہ بچپن ہی سے کتاب کے کیڑے ہونے کا نصیب میں آیا تھا۔ جو پڑھا اور بہترین استادوں سے پڑھا وہ تو حرف جان بنایا ہی۔ اسکے ماسوا بھی جہاں تک ہاتھ پہنچا اسے پڑھنے اور ہضم کر لینے سے نہ چھوڑا۔ سولہ سال کی عمر میں اقبال کی نظم کا عربی ترجمہ کر کے ان سے داو پائی۔ سترہ کی عمر میں سید رشید رضا مصری کے المنار جیسے رسالے میں اپنے مضمون کے ساتھ بار پانا۔ یہ سب اسی علمی و ادبی ذوق اور ماحول کی کار فرمائی تھی۔

لیکن دین اور دینی شعور بھی اپنے اعلیٰ خاندانی ماحول اور دینی تعلیم کی بنا پر برابر کا اثر رکھے ہوئے تھا یہی چیز تھی کہ انیس بیس سال کی عمر میں ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے علم قرآن سے مستفید ہونے کے لئے لاہور گئے تو صرف درسی فائدہ اٹھا کر واپس نہیں آگئے بلکہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں جو باطنی کمالات اور شانِ خدا رکھی تھی کہ اس کا اثر خود درس سے بھی بڑھ کر طبیعت نے قبول کیا خود ہی فرماتے ہیں۔

”میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی جب مولانا احمد علی لاہوری امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ سے نیاز حاصل ہوا۔ میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں جہاں سے زندگی نے نیاراستہ (جہاں تک خیال ہے بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا۔ پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میری زندگی اچھی یا بری۔ بہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوئی اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا۔ خدا شناسی اور خدا رکسی راہیابی اور درست ردی تو بڑی چیزیں ہیں مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق اور خدا کے نام کی جلالت اور مردانِ خدا کی محبت اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔“ (پرانے چراغ حصہ اول ص ۱۳۴)

یہ بات ۳۲-۳۱ء کی ہے کہ لاہوری مرد درویش کے فیض صحبت سے خدا طلبی کے ذوق اور خدا کے نام کی ذائقہ شناسی دولت کا اضافہ، مولانا کے کہنے کے مطابق ان کی شخصیت کے عناصر میں ہوا۔ اب بس ایک آنچ کی کسر اور تھی کہ شخصیت اپنے وقت کی ایک کامل شخصیت کے سانچے

میں ڈھلنے کی راہ پالے۔ اس کسر کے پورا ہونے کا ڈول بھی ٹھیک اسی زمانے میں اس طرح پڑا کہ مولانا کو اپنے خاندانی ہیر و اور فخر ملت اسلامیہ ہند حضرت سید احمد شہید کے حالات و سوانح کے مطالعے کی تحریک بعض اسباب سے پیدا ہو گئی اور پھر سید صاحب کے انقلاب انگیز اور مردم ساز حالات کی دنیا میں چار پانچ سال بسر کر کے جب وہ سیرت شہید کے مسودے کیساتھ باہر آئے تو اپنی علمی و ادبی اور تاریخی شخصیت کیساتھ اور خدا طلی خدایابی کے تازہ یاب ذوق و رجحان کے ساتھ راہ خدا میں آبلہ پائی و سر فروشی کے اس جذبے کی آنچ بھی پا گئے تھے جس سے ایک مومن صادق کی شخصیت تکمیل پاتی ہے۔ اور پھر اس کا اندرون اس صدائے برحق سے گونج اٹھتا ہے کہ ۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دل کے آئینے میں وہ تجھ کو دکھا کر رخ دوست زندگی اور بھی دشوار سے دشوار کرے
لیکن یہ ۱۸۵۷ء کے بعد والا ہندوستان ہے جب تیر و سنال کی آزمائش کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے بلکہ ۱۹۲۳ء کے بھی بعد والا زمانہ جب خلافت اسلامیہ عثمانیہ کی شمشیر خارا شگاف ہماری شومئی اعمال سے دو تیم ہو چکی ہے اب صرف زبان و قلم، دعوت و پکار اور جسم و جاں کی تمام توانائیوں کیساتھ ایک جہد مسلسل ہی سے اندرون کی اس گونج اور تڑپ کیلئے تسکین کا سامان ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کو بھی مولانا سے کچھ اچھی واقفیت کا موقع ملا ہے ان میں شاید کوئی ایک بھی اس معاملہ میں دوسری رائے نہ رکھتا ہو کہ مولانا نے ایک بے تاب روح کیساتھ اپنی تمام علمی و ادبی صلاحیتیں اور جسم و جاں کی گونج انہوں نے سیرت شہید علیہ الرحمہ کی تالیف کے وقت سے اپنے دل و دماغ میں پائی تھی۔ گویا عہدہ شہید کیا ہے تب و تاب جادولہ

لیکن اس ”تب و تاب“ کی روح وہی ”دل کے آئینے میں رخ دوست کی دید“ تھی جو حضرت سید شہید کو شہادت گمہ بالا کوٹ میں لے گئی اور یہ دید اور اس پر مزید ”ہل من مزید“ کی تڑپ اگر نہیں تو یہ ”تب و تاب“ وہ اعتبار اور وہ اعزاز حاصل نہیں کر پاتی جو ہم نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی کے معاملے میں دیکھا۔ ہماری خوش قسمتی کے مولانا مرحوم کو اس شنسی کی قدر و قیمت کا ایسا غیر معمولی احساس میسر آیا تھا کہ انہوں نے اپنی دعوتی جد و جہد ہیں

اس کی اہمیت نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ یہاں زیادہ مثالیں نہیں دی جاسکتیں صرف ایک اقتباس سن لیجئے جو ایسی نماز کی تجدید کی دعوت و ترغیب سے ماخوذ ہے جو نماز ”ربخ دوست“ کو دکھانے والی ہو۔ اپنی مایہ ناز کتاب ”ارکان اربعہ“ میں فرماتے ہیں۔

”تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کی کوشش اور تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب امت کے عوام اور علما میں عشق و محبت اور ایمان و یقین کی اس چنگاری کو دوبارہ بھڑکایا جائے اور دعوت و تربیت اور جہاد و مجاہد اور اس حقیقی پرسوز اور خشوع و خضوع والی نماز کی کچھ جھلکیاں امت میں پھر پیدا ہوں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی خصوصیت اور طاقت تھی۔“ (ص ۱۱۷) اس سٹی کی قدر و قیمت اور اسلامی زندگی میں اسکی اہمیت کا یہ احساس اس مردِ اقبالند کو تھا کہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری جیسے جو مردانِ حق اسکے تجربے میں یا علم و مطالعے میں آئے کہ جن کی رہنمائی یا جن کے نقش قدم کی پیروی سے اس دولتِ بیدار کی راہ کھلتی ہے۔ انکے معاملے میں اس نے جب دیکھا کہ امت کا الجھلکھ کو اصطلاحی غلط فہمیوں کے باعث نہ صرف ان سے کنارہ کش بلکہ انکی مخالفت کو خدمتِ حق سمجھ رہا ہے تو دادِ دینی حق ہے کہ اس مردِ خدا نے اپنی نہایت نمایاں مقبولیت تک کو خطرے میں ڈال کر ایک پوری کتاب ربانیۃ لارہبانیہ کے نام سے ترتیب دے ڈالی۔ بس اسی کے ایک چند سطرے اقتباس پر یہ گفتگو ختم ہوتی ہے کہ اسمیں انس کا ایک پیغام بھی صاف سنا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب کے دیباچے میں ارشاد ہوا ہے۔

وبعد افہذا مقالات کتبت فی أوقات مختلفة وفي مناسبات مختلفة، وبعضها حديث لم يطبع، تجمع بينها وحدة معنوية وهي شرح فكرة على أساس العلم والتجربة، وإيضاح ضرورة أو ثغرة في حياتنا وأخلاقنا لا بد أن تسد ودفاع عن جماعة اشتدت حولها الخصومة في هذا العصر، ومعظم من يخوض فيها ولا يتحس لا يعرفها معرفة شخصية عميقة ولا يتعب نفسه في دراستها وقد اتاح الله للمؤلف، لحكمة يعلمها، فرصة الاتصال بها اتصالاً لا يتأتى لكل من عاش في مثل جوه العلمی وبيئته العصرية، فسجل مشاهداته وانطباعاته وحصيلته

دراستہ و خیالاتہ فی هذه المقالات 'مجموعة فی هذا الكتاب' ننشرها اليوم قیاما بالواجب واعترافا بالجميل و دفاعا عن جماعة تدين لها بعض الأجيال وبعض الأقطار بالدخول فی الإسلام 'أوبالبقاء عليه' راجيا من الله ثواب هذا العمل وعسى ان يحرك ساكن القلوب 'وان يثير كامل الايمان' وان يحمل بعض العقلاء المنصفين على التفكير من جديد' وعلى طلب المزيد 'و بالله التوفيق وله حمد فی الأولى والاخرة. اردو بھی میں عبارت کا مفہوم یوں سمجھئے۔

یہ چند مضامین و مقالات ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے لکھے گئے ہیں لیکن ایک معنوی وحدت نے ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ یہ اپنے علم و تجربے کی بنیاد پر ایک فکر اور ایک خیال کی وضاحت ہے اور ہماری زندگی اور اخلاقیات کیلئے ایک ایسی ضرورت کی نشاندہی ہے کہ اسکی طرف توجہ نہ کرنے سے ایک بڑا بھاری غلار ہوتا ہے۔ یہ دفاع ہے اہل حق کی ایک ایسی جماعت کا جو مسلسل نکتہ چینی میں زیادہ تر جوش دکھانے والے وہ ہیں جو اس جماعت کے بارے میں نہ کوئی مناسب ذاتی واقفیت ہے اور نہ اسکے بارے میں کسی گہرے مطالعے کی زحمت اٹھائی گئی ہے۔

اس مصنف پر اللہ کا یہ ایک بڑا فضل ہے کہ خالص علمی و ادبی ماحول میں رہتے ہوئے جہاں اس جماعت سے رشتہ و تعلق کا موقع عام طور پر نہیں ملا کرتا اسے یہ موقع حاصل ہوا۔

آج یہ مجموعہ مضامین اللہ کی توفیق سے ایک ادائے فرض کے طور پر اس جماعتِ حقہ کے فاع میں شائع کیا جا رہا ہے جسکے احسان سے پورے پورے ملک اور قومیں بسکدوش نہیں ہو سکتیں انہیں کی مخلصانہ اور مجاہدانہ کوششوں کی بدولت انکو اسلام میں داخلے کی دولت یا اس پر قائم رہنے کی عزت ملی۔ یہ اس امید پر شائع کیا جا رہا ہے کہ شاید دلوں کے ساکن سمندر میں اضطراب کی کوئی موج اس سے پیدا ہو ایمان کا جذبہ خفہ جاگ اٹھے۔ اور ملت کے ذہین و فہیم اور حق پسند افراد اس مسئلہ پر از سر نو غور کے لئے اور خوب سے خوب تر کی یافت و دریافت کے لئے آمادہ ہوں۔ توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اول و آخر سزاوار حمد ہے۔

